مخدوم محی الدین

ناشر:- مکتبہ صبا ۱۷ مجرد گاہ، حیدرآباد دکن

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

-----◈◈◈◈◈◈◈◈◈-----

پہلی بار ...... ایک ہزار پانچ سو
اگست ۱۹۶۱ء
قیمت :- ..... ایک روپیہ پچاس نئے پیسے

قیمت :-

سرورق ...... سعید بن محمد

کتابت :- .... محمد مظہر

طباعت :- .. نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چارکمان ۔ حیدرآباد دکن

پڑھنے والوں سے

شعر کہنے کی طرح شعر پڑھنا خود ایک تخلیقی عمل ہے، شعر کہتے ہوئے شاعر اپنے آپ کو بھی بدلتا جاتا ہے شعر پڑھنے والا بھی نہ صرف پڑھنے کے عمل میں بدلتا ہے بلکہ وہ اختراع بھی کرتا ہے اپنے تجربے کی بنا پر۔ جب آپ "گل تر" پڑھیں تو شاید آپ بھی اس عمل سے گزریں۔ ذہن "سرخ سویرا" اور "گل تر" میں مقابلہ بھی کرنے لگے گا۔ شاید یہ خیال بھی آئے کہ کلام کا یہ مجموعہ اپنی سج دھج، نفسِ مضمون، حقیقت، ندرتِ جمالیاتی کیفیت و کمیت اور تاثر کے اعتبار سے "سرخ سویرا" سے مختلف ہے۔

بعض قارئین کو "سرخ سویرا" کی وہ نظمیں اور اشعار شاید یاد آجائیں جو انہیں متاثر کر چکے ہیں:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

جو چھو لیتا ہوں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

یا

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی

اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

سرخ پرچم اور اونچا ہو بغاوت زندہ باد

یہ تھا "سرخ سویرا" کا رنگ، "گلِ تر" میں یہ رنگ ملے گا:

ہجومِ بادہ و گل میں ہجومِ یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے
تحفۂ برگِ گل و بادِ بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے
کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں
آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں
ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخیٔ ایام بھی پی ہے
غم رو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے
اٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو
ہم دمو ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی

۵

کوئے دلدار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقا کی نشاندہی کرتا ہے، پھر بھی انسان دوستی اور رسٹا ہوا جمالیاتی اثر قدر مشترک ہیں۔

زمان و مکاں کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں (TIMELESS) ہوتا ہے اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے، سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں تہذیب انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے، جمالیاتی حس انسانی حواس کی ترقی اور نشو و نما کا دوسرا نام ہے، اگر انسان کو سماج سے الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک گونگا وحشی بن کر رہ جائے گا، جو اپنی جبلتوں پر زندہ رہے گا۔ فنون لطیفہ انفرادی اور اجتماعی تہذیب نفس کا بڑا ذریعہ ہیں جو انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں۔

شاعر اپنے گرد و پیش کے خارجی عالم اور دل کے اندر کی دنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے یہی تضاد تخلیق کی قوت محرکہ بن جاتا ہے

شاعر اپنے دل میں چھپی ہوی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاعر بہ حیثیت ایک فرد معاشرہ، حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے، پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے، روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں واپس

آتا ہے تاکہ نوعِ انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو۔ باہمہ اور بے ہمہ کا یہی وہ نکتہ ہے جسے زوال یافتہ ادیب "انا" اور "انفرادیت" سے تعبیر کرتا ہے۔

شعر میں ہم ماورا کی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماورا نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ شعر بے کاری کی اولاد ہے، مگر میں ایک محروم بے کاری انسان ہوں "گلِ تر" کی نظمیں غزلیں انتہائی مصروفیتوں میں لکھی گئی ہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں لکھنے پر مجبور کیا جا رہا ہوں، سماجی تقاضے پُراسرار طریقے پر شعر لکھواتے رہے ہیں۔ زندگی ہر لحظہ نیا طور نئی "برقِ تجلّی" ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کچھ لکھا ہی نہیں۔

مخدوم محی الدین

۲۴ر جولائی ۱۹۶۱ء

حیدرآباد دکن

قید

قید ہے قید کی میعاد نہیں
جور ہے جور کی فریاد نہیں داد نہیں
رات ہے رات کی خاموشی ہے تنہائی ہے
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے
چونک جاتا ہے دماغ
جھلملا جاتی ہے انفاس کی لَو
جاگ اٹھتی ہے مری شمع شبستانِ خیال
زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے

شاہراہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
اُن کے مصروف قدم
اُن کے ماتھے پہ تردّد کے نقوش
اُن کی آنکھوں غمِ دوش اور اندیشۂ فردا کا خیال
سیکڑوں لاکھوں قدم
سیکڑوں لاکھوں عوام
سیکڑوں لاکھوں دھڑکتے ہوے انسانوں کے دل
جورِ شاہی سے غمیں، جبرِ سیاست سے نڈھال
جانے کس موڑ پہ یہ دھن سے دھماکا ہو جائیں

سالہا سال کی افسردہ و مجبور جوانی کی امنگ
طوق و زنجیر سے لپٹی ہوی سو جاتی ہے
کروٹیں لینے میں زنجیر کی جھنکار کا شور
خواب میں زیست کی سوزش کا پتہ دیتا ہے

مجھے غم ہے کہ میرا گنجِ گراں مایۂ عمر
نذرِ زنداں ہوا
نذرِ آزادئ زندانِ وطن کیوں نہ ہوا

سنٹرل جیل حیدرآباد دکن
۱۹۵۱ء

نیا چین

انساں کی آرزو نے انساں کی جستجو نے
گرتی ہوئی زمیں کو آکاش میں اچھالا
وہ موڑ آگیا ہے مشرق کی زندگی میں
ہر گام پر سویرا، ہر سو نیا اجالا

۱۹۵۱ء

ماسکو

ہند کی دکھیاری جنتا کا سلام لے لے

پیام لے لے

میرے ساتھی ماسکو

سات نومبر کی جیوتی سے ہم نے رستہ پایا

ہم نے اپنا خون بہا کر تجھ سے ہاتھ ملایا

جگت کی جنتا سے مل جل کر جیون گیت بنایا

تیرے نام سے تیرے کام سے ہر سو دیپ جلایا

ہند کی دکھیاری جنتا کا سلام لے لے

پیام لے لے

میرے ساتھی ماسکو

(ماسکو کے ہوائی اڈے پر اترتے ہوئے) ۱۹۵۳ء

چارہ گر

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اُس موڑ پر

دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے

پیار حرفِ وفا
پیار اُن کا خدا
پیار اُن کی چتا

دو بدن

اُوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رُو تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سُبک رو چمن کی ہوا
صرفِ ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر
ایک پل کے لیے رک گئی

ہم نے دیکھا انھیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں

مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں

میکدے کی دراڑوں نے دیکھا انھیں
از ازل تا ابد
یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے ؟
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے ؟

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اُس موڑ پر
دو بدن
چارہ گر !

۱۹۵۶ء

آج کی رات نہ جا

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے دور سے آئی ہے مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اجالوں کا پیام آئے گا
آج کی رات نہ جا

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے

زہر بھی آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے
آج کی رات نہ جا

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لیے تیری محبت کی نظر
آج کی رات نہ جا

۱۹۵۶ء

بھاگ متی

پیار سے آنکھ بھر آتی ہے کنول کھلتے ہیں
جب کبھی لب پہ ترا نام وفا آتا ہے

دشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی
راگ کی رنگ کی برسات یہیں سے نکلی
انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگناتی ہوی ہر رات یہیں سے نکلی

دھن کی گھنگور گھٹائیں ہیں نہ ہُن کے بادل
سونے چاندی کے گلی کوچے نہ ہیروں کے محل
آج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں
خواجۂ شہر ہے یوسف کے خریداروں میں

شہر باقی ہے محبت کا نشاں باقی ہے
دلبری باقی ہے، دلداریٔ جاں باقی ہے
سرِ فہرستِ نگارانِ جہاں باقی ہے
تو نہیں ہے تری چشمِ نگراں باقی ہے

۱۹۵۸ء

چاند تاروں کا بن

(آزادی سے پہلے، بعد اور آگے)

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمعِ صبحِ وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم، مدھوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

صُبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خارزارِ الم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اُچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا

کچھ اِماماں صد مکر و فن
اُن کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
اُن کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے
ہمدمو

ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

۱۹۵۸ء

رقص

وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے کے آگیا
وہ کام دیو کی کمان جام لے کے آگیا

وہ چاندنی کی نرم نرم آنچ میں تپی ہوی
سمندروں کے جھاگ سے بنی ہوی جوانیاں
ہری ہری روش پہ ہم قدم بھی ہم کلام بھی
بدن مہک مہک کے چل
کمر لچک لچک کے چل
قدم بہک بہک کے چل

وہ روپ رنگ راگ کا پیام لے کے آ گیا
وہ کام دیو کی کمان جام لے کے آ گیا

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

۱۹۵۸ء

سیماب وشی، تشنہ لبی با خبری ہے
اِس دشت میں گر رختِ سفر ہے تو یہی ہے

اک شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے

بے صحبتِ رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
گو جام وہی مے وہی میخانہ وہی ہے

اِس عہد میں بھی دولتِ کونین کے باوصف
ہر گام پہ اُن کی جو کمی تھی سو کمی ہے

ہر دم ترے انفاس کی گرمی کا گماں ہے
ہر یاد تری یاد کے پھولوں میں بسی ہے

ہر شام سجائے ہیں تمنّا کے نشیمن
ہر صبح مے تلخئ ایام بھی پی ہے

دھڑکا ہے دلِ زار ترے ذکر سے پہلے
جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

وہ عطر تری کاکلِ شب رنگ نے چھڑکا
مہکی ہے خرد، روح کلی بن کے کھلی ہے

۱۹۵۹ء

تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے
دار سے گذرے تری راہ گذر سے پہلے

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

اس اندھیرے میں اجالوں کا گماں تک بھی نہ تھا
شعلہ رو شعلہ نوا شعلہ نظر سے پہلے

کون جانے کہ ہو کیا رنگِ سحر رنگِ چمن
میکدہ رقص میں ہے پچھلے پہر سے پہلے

نکہتِ یار سے آباد ہے ہر کُنجِ قفس
مِل کے آئی ہے صبا اس گُلِ تر سے پہلے

۱۹۵۹ء

دراز ہے شبِ غم سوز و ساز ساتھ رہے
مسافرو! مے مینا گداز ساتھ رہے

قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں
سفر کٹھن ہے دمِ شعلہ ساز ساتھ رہے

یہ کوہ کیا ہے یہ دشتِ الم فزا کیا ہے
جو اک تری نگہہِ دل نواز ساتھ رہے

کوئی رہے نہ رہے ایک آہ اک آنسو
بصد خلوص بصد امتیاز ساتھ رہے

یہ میکدہ ہے، نہیں سیرِ دیر، سیرِ حرم
نظر عفیف و دلِ پاک باز ساتھ رہے

۱۹۵۹ء

اسی چمن میں چلیں جشنِ یادِ یار کریں
دلوں کو چاک گریباں کو تار تار کریں

شمیمِ پیرہنِ یار کیا نثار کریں
تجھی کو دل سے لگالیں تجھی کو پیار کریں

سناتی پھرتی ہیں آنکھیں کہانیاں کیا کیا
اب اور کیا کہیں کس کس کو سوگوار کریں

اٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اُڑیں گل کو ہمکنار کریں

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں

۱۹۵۹ء

پھر بلا بھیجا ہے پھولوں نے گلستانوں سے
تم بھی آ جاؤ کہ باتیں کریں پیمانوں سے

رُت پلٹ آئے گی، اک آپ کے آ جانے سے
کتنے افسانے ہیں، سننے ہیں جو دیوانوں سے

تحفۂ برگِ گل و بادِ بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

بدلا بدلا سا نظر آتا ہے دُنیا کا چلن
آپ کے ملنے سے، ہم جیسے پریشانوں سے

ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسم ہیں ندیم
مسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے

۱۹۵۹ء

سحر سے رات کی سرگوشیاں بہار کی بات
جہاں میں عام ہوئی چشمِ انتظار کی بات

دلوں کی تشنگی جتنی، دلوں کا غم جتنا
اسی قدر ہے زمانے میں حسنِ یار کی بات

جہاں بھی بیٹھے ہیں جس جا بھی رات مے پی ہے
انھیں کی آنکھوں کے قصے انھیں کے پیار کی بات

چمن کی آنکھ بھر آئی کلی کا دل دھڑکا
لبوں پہ آئی ہے جب بھی کسی قرار کی بات

یہ زرد زرد اُجالے یہ رات رات کا درد
یہی تو رہ گئی اب جانِ بے قرار کی بات

تمام عمر چلی ہے، تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یارِ غمگسار کی بات

۱۹۵۹ء

یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لیے
جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لیے

چٹک رہی ہے کسی یاد کی کلی دل میں
نظر میں رقصِ بہاراں کی صبح و شام لیے

ہجومِ بادہ و گل میں، ہجومِ یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

کسی خیال کی خوشبو کسی بدن کی مہک
درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے

مہک مہک کے جگاتی رہی نسیمِ سحر
لبوں پہ یارِ مسیحا نفس کا نام لیے

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی
اٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے

۱۹۵۹ء

سازِ آہستہ ذرا گردشِ جام آہستہ
جانے کیا آئے نگاہوں کا پیام آہستہ

چاند اُترا کہ اُتر آئے ستارے دل میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

کوئے جاناں میں قدم پڑتے ہیں ہلکے ہلکے
آشیانے کی طرف طائرِ بام آہستہ

ان کے پہلو کے مہکتے ہوئے شاداں جھونکے
یوں چلے جیسے شرابی کا خرام آہستہ

اور بھی بیٹھے ہیں اے دل ذرا آہستہ دھڑک
بزم ہے پہلو بہ پہلو ہے کلام آہستہ

یہ تمنّا ہے کہ اُڑتی ہوی منزل کا غبار
صبح کے پردے میں یاد آ گئی شام آہستہ

۱۹۵۹ء

جانِ غزل

اے دلِ نارسا آج اتنا مچل
مست آنکھوں کی جھیلوں میں کھلنے لگیں آنسوؤں کے کنول
مل گیا راہ میں اجنبی موڑ پر کوئی جانِ غزل
آج تو یاد آئیں نہ دُنیا کے غم
آج دل کھول کر مُسکرا چشمِ نم
آج چھٹکی ہے رخسار کی چاندنی
چھٹ گئیں بدلیاں، کھل گئے پیچ وخم
کتنا بھاری تھا یہ زندگی کا سفر
میری جانِ غزل

خوابِ فردا کی دیوار کی چھاؤں میں
دو گھڑی بیٹھ کر
عشرتِ حال کی مے پئیں
راستے منتظر، گل بداماں ہے ہر رہ گزر
دل کی سنسان گلیوں میں کچھ دیر، کچھ دور تک
آج تو ساتھ چل

۱۹۵۹ء

پیار کی چاندنی

ہدیۂ اشک، خوں لے کے آیا ہوں میں
خوں بہائے وفا! دل کی سوغات کیا
جیب و داماں کی اڑنے لگیں دھجیاں
جرم کیا، جرم غم کی مکافات کیا
عشق کی مشعلیں، عشق کے ولولے
ہم سفر، صبح کیا، شام کیا، رات کیا

چشمِ اہلِ ہوس مسکراتی ہے گر
چشمِ اہلِ ہوس مسکراتی رہے

ابنِ آدم کو سولی چڑھاتے رہو
زندگانی سرِ دار گاتی رہے
یادِ یاراں میں اک جامِ غم اور دو
رات کی تیرگی سوز گاتی رہے
دل بڑھاتی رہیں ہاتھ کی نرمیاں
پیار کی چاندنی جگمگاتی رہے

۱۹۵۹ء

اب کہاں جا کے یہ سمجھائیں کہ کیا ہوتا ہے
ایک آنسو جو سرِ چشمِ وفا ہوتا ہے

اس گذر گاہ میں اس دشت میں اے جذبۂ شوق
جز ترے کون یہاں آبلہ پا ہوتا ہے

دل کی محراب میں اِک شمع جلی تھی سرِ شام
صبح دم ماتمِ اربابِ وفا ہوتا ہے

دیپ جلتے ہیں دلوں میں کہ چتا جلتی ہے
اب کی دیوالی میں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے

جب برستی ہے تری یاد کی رنگین پھوار
پھول کھلتے ہیں درِ میکدہ وا ہوتا ہے

۱۹۵۹ء

روشن ہے بزمِ شعلہ رُخاں دیکھتے چلیں
اس میں وہ ایک نورِ جہاں دیکھتے چلیں

وا ہو رہی ہے میکدۂ نیم شب کی آنکھ
انگڑائی لے رہا ہے جہاں دیکھتے چلیں

سرگوشیوں کی رات ہے رخسار و لب کی رات
اب ہو رہی ہے رات جواں دیکھتے چلیں

دل میں اتر کے سیرِ دلِ رہرواں کریں
آہوں میں ڈھل کے ضبطِ فغاں دیکھتے چلیں

کیسے ہیں خانقاہ میں اربابِ خانقاہ
کس حال میں ہے پیرِ مغاں دیکھتے چلیں

ماضی کی یادگار سہی یادِ دل تو ہے
طرزِ نشاطِ نوحہ گراں دیکھتے چلیں

سب وسوسے ہیں گردِ رہِ کارواں کے ساتھ
آگے ہے مشعلوں کا دھواں دیکھتے چلیں

آنچل سے اڑ رہے ہیں فضاؤں میں دور دور
شاید وہیں ہو جانِ بتاں دیکھتے چلیں

آ ہی گئے ہیں رقص گہِ گل رخاں میں ہم
کچھ رنگ و بو کا سیلِ رواں دیکھتے چلیں

۶۱۹۶۰

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزا آخرِ شب
اور بھی سرخ ہے رخسارِ حیا آخرِ شب

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیرِ درِ میخانہ
کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخرِ شب

سانس رکتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی
کوئی لیتا تھا ترا نامِ وفا آخرِ شب

گُل ہے قندیلِ حرم گُل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑھے دستِ دعا آخرِ شب

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ سر بہ گریباں ہے جفا آخرِ شب

اسی انداز سے پھر صبح کا آنچل ڈھلکے
اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

۱۹۶۰ء

وہ جو چھپ جاتے تھے کعبوں میں صنم خانوں میں
ان کو لا لا کے بٹھایا گیا دیوانوں میں

فصلِ گل ہوتی تھی کیا جشنِ جنوں ہوتا تھا
آج کچھ بھی نہیں ہوتا ہے گلستانوں میں

آج تو تلخیِ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

آج تک طنزِ محبت کا اثر باقی ہے
قہقہے گونجتے پھرتے ہیں بیابانوں میں

وصل ہے ان کی ادا ہجر ہے ان کا انداز
کونسا رنگ بھروں عشق کے افسانوں میں

شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی مخدومؔ
تذکرے رستوں میں چرچے ہیں پری خانوں میں

۱۹۶۰ء

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی

پھول کے ہار، پھول کے گجرے
شام پھولوں کی رات پھولوں کی

آپ کا ساتھ، ساتھ پھولوں کا
آپ کی بات، بات پھولوں کی

نظریں ملتی ہیں جام ملتے ہیں
مل رہی ہے حیات پھولوں کی

کون دیتا ہے جان پھولوں پر
کون کرتا ہے بات پھولوں کی

وہ شرافت تو دل کے ساتھ گئی
لٹ گئی کائنات پھولوں کی

اب کسے ہے دماغ تہمتِ عشق
کون سنتا ہے بات پھولوں کی

میرے دل میں سرورِ صبحِ بہار
تیری آنکھوں میں رات پھولوں کی

پھول کھلتے رہیں گے دنیا میں
روز نکلے گی بات پھولوں کی

یہ مہکتی ہوئی غزل مخدومؔ
جیسے صحرا میں رات پھولوں کی

۱۹۶۰ء

تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چپ ہے
شاخِ گل کھوئی ہوئی مرغِ خوش الحاں چپ ہے

افقِ دل پہ دکھائی نہیں دیتی ہے دھنک
غمزدہ موسمِ گل ابرِ بہاراں چپ ہے

عالمِ تشنگیِ بادہ گساراں مت پوچھ
میکدہ دور ہے مینائے زرافشاں چپ ہے

اور آگے نہ بڑھا قصۂ دل قصۂ غم
دھڑکنیں چپ ہیں سرشکِ سرِ مژگاں چپ ہے

شہر میں ایک قیامت تھی قیامت نہ رہی
حشر خاموش ہوا فتنۂ دوراں چپ ہے

نہ کسی آہ کی آواز نہ زنجیر کا شور
آج کیا ہو گیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے

۱۹۶۰ء

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشمِ نم مسکراتی رہی رات بھر

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر

بانسری کی سُریلی سہانی صدا
یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز آتی رہی رات بھر

۱۹۶۰ء

(اماں مرحوم کے نام)

عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے

ہجر میں ملنے شبِ ماہ کے غم آئے ہیں
چارہ سازوں کو بھی بلواؤ کہ کچھ رات کٹے

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

چشم و رخسار کے اذکار کو جاری رکھو
پیار کے نغمے کو دہراؤ کہ کچھ رات کٹے

آج ہو جانے دو ہر ایک کو بدمست و خراب
آج ایک ایک کو پلواؤ کہ کچھ رات کٹے

کوہِ غم اور گراں، اور گراں، اور گراں
غمزدو تیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

۱۹۶۰ء

فاصلے

کماری اندرا دتن راج گیرجی کی ایک انگریزی نظم 'Yearning' کے مرکزی خیال سے متاثر ہو کر

یہ مقدّر یہ مشیّت کہ ملاقات ہوی
بات ہونی تھی بہر حال وہی بات ہوی
پر تو انجان رہا میرے لیے
آج تک ایک معمہ ہی رہا تیرا وجود
جانتا ہوں تو بہت دور ہے پربت کی طرح
جو سرافراز درختوں میں کھڑا رہتا ہے تنہا تنہا
حلقۂ غم میں اکیلا تنِ تنہا تو بھی
دور سے سر کے اشاروں سے بلاتا ہے مجھے
اسی پربت کی طرح

مجھے معلوم نہیں

مدعا کیا ہے، ترے دل کی تمنا کیا ہے
خود میرے درد کا درماں، مرا ارماں کیا ہے
مجھے معلوم نہیں
دل کو تسکین نہیں، روح کو آرام نہیں
عرصۂ دہر میں اک معرکہ آرائی ہے
بے طرح دست و گریباں ہے خرد اور جنوں
دل کی گہرائی میں سنتا ہوں ترے ساز کی دل گیر صدا
گونجتی ہے تری آواز مرے دل کے نہاں خانے میں
تجھ سے ملنے جو میرے دل نے پذیرائی کی
آنکھ بھر آئی چھلکنے لگا احساس کا جام
تو جو مستور بھی ہے، دور بھی ہے
جو سرافراز درختوں میں کھڑا رہتا ہے تنہا تنہا
دور . . . پربت کی طرح

تجھ سے لپٹا ہی رہا دوریٔ منزل کا غبار
تھرتھراتا ہی رہا تارِ نظر
جھلملاتی ہی رہی شمعِ امید
دل دھڑکتا ہی رہا
تجھ سے کیا مانگوں بہ جُز حرفِ وفا
تجھ سے کیا چاہوں بہ جُز پاسِ نظر
آ اور اس تشنگیٔ دل کا مداوا کر دے
تو جو مستور بھی ہے دور بھی ہے
جو سر افراز درختوں میں کھڑا رہتا ہے تنہا تنہا
دور . . . . پربت کی طرح

زندگی نوکِ سناں
زندگی مثلِ سناں جسم میں جاں میں اتر جاتی ہے
زندگی سود و زیاں

زندگی ایک دو دھاری تلوار

کاٹ دیتی ہے بہ یک جنبشِ لب

نفع و ضرر، سود و زیاں

پیار کٹ جاتے ہیں کٹ جاتی ہے جاں

حسن کی جوئے خنک عشق کے شعلوں کی لپک

بغض و تعزیر و ملامت کے سبھی کوہِ گراں

بال کی طرح سے کٹ جاتے ہیں

زندگی نوکِ سناں

زندگی ہے کہ بدلتا ہوا افلاک کا رنگ

چشمِ خوباں ہے جو، سو رنگ میں ہے جلوہ نما

زندگی خوئے منافق، کبھی سایہ کبھی نور

تو کہ اک چشمۂ اخلاص بلاتا ہے مجھے

میں کہ اک بحرِ حقیقت کے مقابل ہوں ترے

تو کہ یکتا بھی ہے، تنہا بھی ہے، بے بس بھی ہے

زندگی نوکِ سناں

دل مقدّر ہے، مشیّت ہے وصال
راہ تکتا ہے مقدر کہ ملے جسم سے جاں
راہ یوں تکتا ہے جیسے کسی اوتار و پیمبر کو ترستا ہو جہاں
ایک جہاں
راندۂ درگاہِ حیات
اپنی تکمیلِ خودی میں متلاشی بھی ہے بے تاب بھی ہے
گنگنائے بھی نہیں جاتے ہیں الفاظ کہ مر جاتے ہیں
شررِ زندگی بجھ جاتا ہے شعلہ نہیں ہونے پاتا
ارتقا کا یہی اک نکتۂ نایاب
یہی رازِ سراپردۂ ذات
حاصلِ روز و شب و سلسلۂ موت و حیات
دشتِ فرقت میں تو بن جاتا ہے اک موجِ سراب
تو سرافراز درختوں میں کھڑا رہتا ہے تنہا تنہا
دور ... پربت کی طرح

میں کہ درماندہ مسافر ترے دروازے پر

مثلِ حباب

دستِ بے رحمئ دوراں کی عنایات کا مارا آیا

تیری آنکھوں میں جو ڈالیں آنکھیں

گتھیاں کھل گئیں

حل ہو گئے اسرارِ حیات

ایک ہی پل میں ملے

برقِ فنا آبِ حیات

تو سر افراز درختوں میں کھڑا رہتا ہے تنہا تنہا

آ اور آ کے حقیقت کے مقابل ہو جا

۶۱۹۶۰

احساس کی رات

مجھے ڈر ہے کہیں سرد نہ ہو جائے یہ احساس کی رات
نرغے طوفان حوادث کے، ہوس کی یلغار
یہ دھماکے، یہ بگولے، سر راہ
جسم کا جان کا پیمان وفا کیا ہوگا؟
تیرا کیا ہوگا مرے تارِ نفس
تیرا کیا ہوگا اے مضرابِ جنوں
یہ دہکتے ہوے رخسار
یہ مہکے ہوے لب
یہ دھڑکتا ہوا دل

شفق زیست کی پیشانی کا رنگیں قشقہ

کیا ہوگا

اُڑ نہ جائے کہیں یہ رنگِ جبیں

مٹ نہ جائے کہیں یہ نقشِ وفا

چُپ نہ ہو جائے یہ بجتا ہوا ساز

شمعیں اب کون جلائے گا سرِ شام گذرگاہوں میں

دہر میں لطف و عطا کچھ بھی نہیں

دہر میں مہر و وفا کچھ بھی نہیں

سجدہ کچھ بھی نہیں نقشِ کفِ پا کچھ بھی نہیں

میرے دل اور دھڑک

شاخِ گل

اور مہک اور مہک اور مہک

۱۹۶۰ء

چپ نہ رہو

(لوممبا کے قتل پر)

شب کی تاریکی میں اک اور ستارہ ٹوٹا
طوق توڑے گئے، ٹوٹی زنجیر
جگمگانے لگا ترشے ہوئے ہیرے کی طرح
آدمیت کا ضمیر

پھر اندھیرے میں کسی ہاتھ میں خنجر چمکا
شب کے سناٹے میں پھر خون کے دریا چمکے
صبح دم جب مرے دروازے سے گزری ہے صبا
اپنے چہرے پہ ملے خونِ سحر گزری ہے

خیر ہو مجلسِ اقوام کی سلطانی کی
خیر ہو حق کی صداقت کی جہاں بانی کی
اور اونچی ہوی صحرا میں امیدوں کی صلیب
اور اک قطرۂ خوں چشمِ سحر سے ٹپکا
جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے
تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے
روز ہو جشنِ شہیدانِ وفا چپ نہ رہو
بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو چپ نہ رہو

۱۹۶۱ء

گگارِن

مبارک تجھے او زمیں کے مسافر
زمین و زماں کی حدیں توڑ کر
آسمانوں پہ جانا
ہواؤں سے آگے خلاؤں سے آگے
مہ و کہکشاں کی فضاؤں سے آگے
مبارک ستاروں کی چلمن ہٹانا
سرِ زلفِ ناہید کو چھو کے آنا
دلِ ابنِ آدم کی دھڑکن سنانا

۷۵

مبارک تجھے او زمیں کے مسافر
زمین و زماں کی حدیں توڑ کر
آسمانوں پہ جانا

۱۹۶۱ء

ہم دونوں

(کماری اندرا دھن راج گیر جی کی نظم Both of us کا آزاد ترجمہ)

رات ہے، باتیں ہیں، سرگوشی ہے
تو ہے، میں ہوں
اپنے گوندھے ہوئے غم کے بندھن
شب کے سناٹے میں
جاگ اٹھتے ہیں، تڑپ جاتے ہیں، چلاتے ہیں
دامِ افسون وطلسمات میں پھنس جاتا ہے دل
جسم اور جان کو کھا جاتا ہے غم
نیشِ غم اور دلِ زار میں پیکار چلی جاتی ہے

گرم گرم آنسو ڈھلک جاتے ہیں رخساروں پر
زندگی یادوں کا مینا ربنا لیتی ہے
جو اڑاتا ہے جہاں میں ابدیت کا مذاق
دیکھتے دیکھتے چپ چاپ بکھر جاتی ہے تاروں بھری رات
چاند چھپ جاتا ہے
رات ہے ، باتیں ہیں ، سرگوشی ہے
تو ہے میں ہوں
ان پرندوں کی طرح سرگوشی
جو دبی سانس میں اگاتے ہیں بچھڑنے کے لیے
گیت — تاروں بھری راتوں میں جسے ہم نے بُنا
دھیمی آواز میں سرگوشی کے انداز میں گایا ہوا گیت
ہاتھ تھرائے ، جدائی کی گھڑی آپہنچی
ہاتھ میں لے لیے میں نے ترے ہاتھ
تاکہ ان ہاتھوں کو پہچانوں

اُن ہاتھوں سے محبت کر لوں

جسم اور جان کے رشتوں سے بکھر جانے تک

جاوداں شعلۂ جوالہ کی اک چنگاری

میں نے لے لی ہے ترے ہونٹوں سے

میں جہاں بھی رہوں، جس جا بھی رہوں

اپنی آنکھیں تو افق زاروں پہ ملتی ہی رہیں گی کہیں دور

اور دل چپکے سے مل جائیں گے دل ہی دل میں

میرے سیلاب تخیل میں تری یاد اے دوست

اس طرح تیرے گی

صبح دم تیرتا پھرتا ہے کسی جھیل میں جیسے کوئی ہنس

ان ہواؤں میں ترے گیت

وہ بکھرے ہوئے گیت

گونج اٹھیں گے مرے کانوں میں

میرے ہمدم

میرے دوست!

۱۹۵۱ء

سنّاٹا

کوئی دھڑکن

نہ کوئی چاپ

نہ سنبھل

نہ کوئی موج

نہ ہلچل

نہ کسی سانس کی گرمی

نہ بدن

ایسے سنّاٹے میں اک آدھ تو پتّا کھڑکے

کوئی پگھلا ہوا موتی

کوئی آنسو

کوئی دل

کچھ بھی نہیں

کتنی سنسان ہے یہ راہ گزر

کوئی رخسار تو چمکے، کوئی بجلی تو گرے

۱۹۶۱ء

نیند

یہ کس پیکر کی رنگینی سمٹ کر دل میں آتی ہے
مری بے کیف تنہائی کو یوں رنگیں بناتی ہے
یہ کس کی جنبشِ مژگاں ربابِ دل کو چھوتی ہے
یہ کس کے پیرہن کی سرسراہٹ گنگناتی ہے
مری آنکھوں میں کس کی شوخیٔ لب کا تصور ہے
کہ جس کے کیف سے آنکھوں میں میری نیند آتی ہے
سکوت اور شانتی کے ہر قدم پر پھول برساتی
اسیرِ کاکلِ شب گوں بنا کر مسکراتی ہے

قطعہ

یہ رقص، رقصِ شرر ہی سہی مگر اے دوست
دلوں کے ساز پہ رقصِ شرر غنیمت ہے
قریب آؤ ذرا اور بھی قریب آؤ
کہ روح کا سفرِ مختصر غنیمت ہے

۱۹۶۱ء

سیاہ رات جرائم پناہ ظلم بدوش
سیاہ رات میں بدکار مست اور مدہوش
سیاہ رات میں مقتول عصمتوں کا خروش
سیاہ رات میں باغی عوام برق بدوش

اٹھے ہیں تیغ بکف یوں بصد ہزار جلال
وہ کوہ و دشت کے فرزند کھیتیوں کے لال
چمک رہی ہے درانتی اچھل رہے ہیں کدال
بنائے قصرِ امارت شکستہ و پامال

لرز لرز کے گرے سقف و بام زرداری
ہے پاش پاش نظامِ ہلاکو و زاری
پڑی ہے فرقِ مبارک پہ ضربتِ کاری
حضورِ آصفِ سابع پہ ہے غشی طاری

تلنگانہ

دیارِ ہند کا وہ راہبر تلنگانہ
بنا رہا ہے نئی اک سحر تلنگانہ
بلا رہا ہے بہ سمتِ دگر تلنگانہ
وہ انقلاب کا پیغامبر تلنگانہ

امامِ تشنہ لباں خضرِ راہِ آبِ حیات
اندھیری رات کے سینے میں مشعلوں کی برات
مرا ثبات مری کائنات میری حیات
سلام مہرِ بغاوت سلام ماہِ نجات

مری آنکھوں میں گھل جاتی ہے وہ کیفِ نظر بن کر
مجھے قوس و قزح کی چھاؤں میں پہروں سلاتی ہے
سحر تک وہ مجھے چمٹائے رکھتی ہے کلیجے سے
دبے پاؤں کرن خورشید کی آکر جگاتی ہے

۱۹۳۸ء

بدل رہی ہے یہ رنج و عذاب کی دنیا
ابھر رہی ہے نئے آفتاب کی دنیا
نئے عوام نئی آب و تاب کی دنیا
وہ رنگ و نور کی محفل شباب کی دنیا

سلام سرخ شہیدوں کی سرزمین سلام
سلام عزم بلند آہنی یقین سلام
مجاہدوں کی چمکتی ہوی جبین سلام
دیارِ ہند کی محبوب ارضِ چین سلام

۱۹۴۷ء

تماشائی

ادھر آ، اے مرے ناداں تماشائی ادھر آ

نہیں ہے ہم میں کوئی آلِ قیصر آلِ عثمانی
نہیں ہے گنجِ قاروں تختِ جم تختِ سلیمانی
نہ ہم میں طغرل و سنجر نہ ہم میں ظلِ سبحانی
خدا سویا ہوا ہے جل رہی ہے شمعِ شیطانی
نہیں رکھتے ہیں کچھ بھی نورِ عرفانی تو رکھتے ہیں
محل رکھتے نہیں ہیں زورِ طغیانی تو رکھتے ہیں

ادھر آ، اے مرے ناداں تماشائی ادھر آ

(نا تمام)

۱۹۴۷ء

وہی ہیں یادیں، وہی آہِ صبح گاہ کا رنگ
نہ اب وہ پہلی سی باتیں نہ وہ نگاہ کا رنگ

کبھی کبھی کی ملاقات تھی سو وہ بھی نہیں
رہا نہ دہر میں اب لطفِ گاہ گاہ کا رنگ

دھڑک گئے ہیں کبھی دل، کبھی جھکی ہے نظر
کہاں چھپا ہے کسی سے کسی کی چاہ کا رنگ

اُسی ادا سے اُسی بانکپن کے ساتھ آؤ
پھر ایک بار اُسی انجمن کے ساتھ آؤ

ہم اپنے ایک دلِ بے خطا کے ساتھ آئیں
تم اپنے محشرِ دار و رسن کے ساتھ آؤ

فسوں کی رات میں اُڑتے ہوئے سے افسانے
یہ کاکلوں کی سلونی گھٹا رہے نہ رہے
کہ پھر یہ رات یہ ٹھنڈی ہوا رہے نہ رہے

بنتے رہے بگڑتے رہے کاروبارِ شوق
اک ہم کہ آرزو کا سہارا بنے رہے